اقبال اور تصوف

خلیفہ عبدالحکیم

کم و بیش ہزار برس سے وہ نظریۂ حیات اور انداز عمل جسے تصوف کہتے ہیں مسلمانوں کی روحانی ، اخلاقی اور عملی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے ۔ طلوع اسلام میں نہ کہیں تصوف کا لفظ ملتا ہے اور نہ صوفی کی اصطلاح ۔ محققین نے اس پر بہت کچھ تحقیق کی ہے کہ یہ اصطلاحیں کب رائج ہوئیں اور ان کا مفہوم مختلف زمانوں میں کس کس طرح بدلتا رہا ہے ۔ اس جگہ ان مباحث کا استقرا کرنا دشوار ہے ۔ چند الفاظ میں اس کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ تصوف کا نظریہ یہ ہے کہ دین کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ۔ ہر عمل کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک باطنی کیفیت ۔ عبادات کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ۔ کتاب الٰہی کا بھی ایک پہلو ظاہر ہے اور دوسرا پہلو وہ ہے جسے حکمت یا معرفت کہہ سکتے ہیں ۔ شریعت میں بھی ایک ظاہری پابندی ہے اور ایک اس کی روح ہے ۔ یہی حال عام اخلاق کا ہے اور ان آداب و رسوم و قوانین کا جنہیں حقوق العباد کہتے ہیں ۔ عبادت میں بھی ایک مرتبہ عبودیت کا ہے لیکن عبودیت خالص اور منزہ ہوتی ہوئی عشق کے درجے تک پہنچ جاتی ہے اور عشق اپنے کمال میں عاشق و معشوق کی دوئی کو مٹا دیتا ہے ۔ خدا معبود ہونے کے بجائے محبوب ہو جاتا ہے اور محب محبوب کی صفات سے ہم آہنگ اور یک رنگ ہو کر وجہ اللہ کا ایک رخ بن جاتا ہے ۔ شریعت پر اس انداز سے عمل پیرا ہونا کہ بندے کو معرفت اور عشق تک پہنچا دے اور ہر ظاہر کو باطن سے وابستہ کرے اس کو طریقت کہتے ہیں ۔ اخلاق کے بارے میں تصوف یہ ہے کہ انسان نیکی اس لئے نہ کرے کہ اس سے کوئی مادی یا خارجی یا جسمانی جزا ملتی ہے یا ملے گی اور بدی سے اس لئے نہ بچے کہ اس کی وجہ سے ابد الاباد تک دوزخ کی آگ میں جلنا پڑے گا ، بلکہ نیکی کو آپ ہی اپنا اجر اور بدی کو آپ ہی اپنی سزا سمجھے ، اس لئے کہ نیکی سے تزکیۂ نفس اور محبت کی مشق اور ترقی ہوتی ہے اور تزکیۂ نفس سے انسان کی ذات صفات الٰہیہ سے بہرہ اندوز ہوتی ہے ۔ بدی سے روح کے اندر تاریکی اور پستی پیدا ہوتی ہے ، تزکیۂ نفس سے جو علوِ ذات اور بلندیٔ درجات حاصل ہوتی ہے وہی اجر حقیقی اور جنت الماویٰ ہے اور روح کی تاریکی اور پستی اور معرفت سے دوری اصلی دوزخ ہے ۔ تصوف کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں لیکن ان سب کا لب لباب یہی ہے ۔ صوفی معرفت اور محبت سے لبریز ہوتا ہے ، اس کا علم اور اس کا عمل ، اس کی

گویائی اور اس کا سکوت محبت و عرفان کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔

جس طرح نبی کریم کی تلقین و تعلیم اور نزول قرآن سے قبل بھی دنیا میں اسلام موجود تھا اسی طرح وہ چیز بھی جا بجا مختلف رنگوں میں ادیان و ملل میں موجود تھی جسے تصوف کہتے ہیں ۔ لیکن جس طرح توحید کے ساتھ رفتہ رفتہ مشرکانہ عناصر جمع ہو گئے تھے اور اسلام کو پھر نئے سرے سے توحید کو منزہ اور پاکیزہ بنانا پڑا اسی طرح قرآن کی تعلیم نے ان عناصر کا بھی جائزہ لیا جو تصوف کے رنگ میں بدھ مت ، ویدانت ، عیسائیت اور فلاطینوس کی جدید فلاطونیت میں پائے جاتے تھے ۔ بدھ مت نے زندگی سے گریز اور ہر قسم کی تمنا کے استیصال کو مقصد حیات قرار دیا اور یہ اصول قائم کر دیا کہ نفیٔ حیات مقصد حیات ہے ۔ وہ لاالہ سے الااللہ کی طرف قدم نہ اٹھا سکی اور اس کی صورت ایسی بن گئی کہ زندگی کے ساتھ خدا کی بھی نفی ہو گئی ۔ ویدانت کا نظریہ تصوف بھی بقا کی بجائے فنا کی تعلیم بن گیا ۔ خدا کی ذات کے متعلق نیتی نیتی رہ گیا یعنی خدا یہ بھی نہیں ہے اور وہ بھی نہیں اور زمان و مکاں اور تمام عالم رنگ و بو مایا یعنی سیمیا ہے جس کا نہ کوئی حقیقی وجود ہے اور نہ کوئی مقصد یا مصرف ۔ عیسائیت نے دین کو رہبانیت کا مترادف بنا دیا ۔ مسیح علیہ‌السلام نے یہودیوں کے ظاہر پرست مدعیان دین کو ظاہر سے باطن کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے بعد عیسائیت نے یہ غلط راستہ اختیار کر لیا کہ دنیا کی کوئی چیز قابل توجہ نہیں اور یہ دنیا چند روز میں ختم ہونے والی ہے اس لئے اس کے کسی پہلو کی تعمیر و تکمیل ایک عبث فعل ہے ۔ ظاہر اور باطن ، جسم اور روح میں ایک تضاد اور ثنویت پیدا ہو گئی اور یہ باطل عقیدہ راسخ ہو گیا کہ دنیا کی تحقیر و تذلیل اور نفس کشی سے قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے ۔ کنبہ سازی اور کنبہ پروری ، تجارت اور معیشت ، معاشرت اور سیاست سب سے روگردانی کرنا ہی دین کا کمال ہے ۔ فلاطینوس نے ذات مطلق کو ورا الورا قرار دیا جس میں نہ کوئی مقصد ہے اور نہ ارادہ اور نہ مخلوق اور نفوس کے ساتھ اس کا کچھ رابطہ ہے ۔ تمام ہستیاں مختلف تنزلات سے اس سے خود بخود سرزد ہوتی ہیں ۔ تمام زندگی ایک غیر شعوری تنزل کا نتیجہ ہے ۔ روح کے واپس ذات مطلق کی طرف عروج کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یکے بعد دیگرے ان تمام تنزلات سے پیچھا چھڑا کر رجعت الی الذات کی کوشش کی جائے ، لیکن ذات مطلق میں نہ عقل ہے نہ شعور ، نہ ارادہ ہے اور نہ محبت ۔ یہ سب چیزیں یکے بعد دیگرے تنزلات سے پیدا ہوئی ہیں ۔ زندگی کا مقصد یہ نہیں کہ فرد اپنے ارادوں کو خدا کے ارادوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دے کیونکہ خدا کی ذات میں تو کوئی ارادہ یا مشیت ہے ہی نہیں ۔ مختلف قوموں میں تصوف نے

علمی اور عملی حیثیتوں میں یہی رنگ اختیار کر لیا تھا ۔ اسلام در حقیقت اس تمام حیات گریز اور فنا پسند تصور کے خلاف ایک زبردست احتجاج تھا ۔ اسلامی توحید نے خالق کا مخلوق سے اور علم کا عمل سے اور دنیا کا آخرت سے رشتہ جوڑا ، تمام کائنات اور مخلوقات کو خدا کی مشیت اور ربوبیت کا مظہر قرار دیا ۔ انسان کو خلیفہ اللہ علی ارض اور مسخر کائنات بنایا ۔ زندگی کی تمام نعمتیں جائز حدود کے اندر اس کے لئے حلال کر دیں اور عمل صالح سے ان میں اضافہ کرنے اور ان کو ترقی دینے کی تلقین کی ۔ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد متعین کر دئے ۔ خدمت خلق کو مقصد شریعت ، اصل طریقت اور حصول معرفت کا ذریعہ قرار دیا ۔ مظاہر عالم کے علم کو دین کا اہم جزو بنایا اور انسانوں کے لئے ہمہ سمتی ترقی کے راستے کھول دئے ۔

اقبال نے جب مسلمانوں کی زندگی ، اسلام اور تصوف پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس طرح دیگر اقوام و ملل میں دین اور تصوف کے ساتھ کچھ مشرکانہ عناصر اور کچھ زندگی سے گریز کی تلقین داخل ہوگئی ، وہی کچھ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے نظریۂ حیات کا بھی حشر ہوا ہے ۔ فرار عن الحیات نے یہ تعلیم عام کردی کہ اس بات سے ہٹ کر نفی پر زور دیا جائے ۔ یکے بعد دیگرے سب چیزوں کو ترک کرتے چلے جاؤ تو علی الاطلاق معرفت حاصل ہو جائے گی ۔ دنیا کو بھی چھوڑو اور عقبیٰ کو بھی چھوڑو ، خدا کو بھی چھوڑو اور پھر سب کچھ چھوڑنے کے خیال کو بھی چھوڑو : ترک دنیا ، ترک مولی ، ترک عقبیٰ ، ترک ترک ۔ کفر و دین کا جھگڑا بھی ایک فضول جھگڑا ہے :

بازیچۂ کفر و دین بطفلان بسپار بگذر زخدا ہم کہ خدا ہم حرفے ست

لاالہ کی جگہ لاموجود الااللہ کا کلمہ وضع ہوگیا اور اس کے معنی یہ لئے گئے کہ اللہ کے وجود کے سوا باقی ہر چیز کا وجود وہمی اور باطل ہے ، فریب ادراک اور سیمیائے تصور ہے ۔ انسان کے لئے اپنے وجود کا احساس نہ صرف وہمی اور اعتباری ہے بلکہ سراسر گناہ ہے ۔ یہ نہیں کہ انسانی وجود سے گناہ بھی سرزد ہوتے رہتے ہیں بلکہ خود وجود کا احساس ہی سب سے بڑا گناہ ہے : وجود ک ذنب ۔ ایک برگزیدہ صوفی لکھتے ہیں کہ دنیا ایسی حقیر چیز ہے کہ جب سے خدا نے اس کو خلق کیا کبھی دوبارہ مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا ۔ غیر اسلامی افکار نے بعض صوفیوں کے ذہنوں سے یہ خیال نکال دیا کہ دنیا خدا کی رحمت اور ربوبیت کا مظہر ہے اور زندگی کا مقصد اس ربوبیت اور رحمت سے عملاً بہرہ اندوز ہونا ہے اور ہر جائز چیز کی محبت محبت الہی ہی کا ایک کرشمہ ہے ۔ جبر و اختیار کے مسئلے میں بہت سے صوفیاء نے جبر کا مسلک اختیار کر لیا

اور توحید اسلامی کو غیر اسلامی نظریہ' وحدت وجود میں اس انداز سے منتقل کیا کہ اشیا' کا وجود اور انسان کا اختیار اس میں ایک بے بنیاد وھم بن کر رہ جائے۔ گلشن راز کا مصنف کہتا ہے :

ہر آنکس را کہ مذہب غیر جبر است　　نبی فرمود کہ مانند گبر است

جس کا مذہب جبر نہیں ہے وہ مومن نہیں بلکہ گبر ہے۔ بیدل کہتا ہے :

صورت وھمی بہ ہستی متہم داریم ما
چون حباب آئینہ برطاق عدم داریم ما

عدمی عدم، عدمی عدم، ز عدم چہ صرفہ بری عبث۔

اس قسم کے نظریہ' حیات سے خیر و شر کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور جدوجہد کی قوتیں مفلوج ہوجاتی ہیں۔ امریکہ کے مشہور مفکر ولیم جیمز کا قول ہے کہ وحدت وجود کا اس قسم کا نظریہ اخلاق تعطیل ہے۔ جب خیر و شر کا امتیاز اٹھ جائے تو جدوجہد کس لئے کی جائے؟ وحدت وجود کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور انفرادی ہستیاں اس میں موج و حباب کی طرح اٹھتیں اور ناپید ہوتی رہتی ہیں۔ یہ وحدت نہ کسی کی دوست ہے اور نہ کسی کی دشمن اسی لئے مرد عارف سے بھی کسی قسم کی دوستی اور دشمنی کا تقاضا نہیں کرتی۔ سحابی کی ایک رباعی ہے :

عالم بخروش لا الہ الا ہوست
غافل بہ گمان کہ دشمن است و یا دوست
دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ یک کشاکش با اوست

ہر کس و ناکس خس یا تنکا ہے جو اس بحر بیکران میں تھپیڑے کھا رہا ہے۔ اقبال نے اسلام اور نوع انسان کی یہ بڑی خدمت کی کہ حقیقی اسلام اور روح پرور تصوف میں سے غیر اسلامی عناصر کو چن چن کر الگ کردیا۔ اقبال ہر قسم کے تصوف کا مخالف ہوتا تو عارف رومی کا مرید کیسے بنتا؟ صحابہ کرام کے بعد صوفیائے کرام میں سے اس کو رومی سب سے زیادہ حقیقی اسلام کے قریب معلوم ہوا اس لئے کہ رومی جبری نہیں ہے بلکہ اس کا قائل ہے کہ انسان ایک صاحب اختیار ہستی ہے اور اس کو نفس اور خودی اس لئے عطا کی گئی ہے کہ اس کو قوی تر اور وسیع تر کرتا ہوا علم او عمل میں ترقی کرتا ہوا خدا میں فنانہ ہوجائے بلکہ الوہیت کو اپنا لے۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر عشق کے ذریعے سے زندگی کو ابھارنا اور سنوارنا مقصد حیات ہے۔ ترک دنیا، خدا کی طرف واپس جانے کا راستہ نہیں۔ ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ ترقی کا پہلا اور لازمی قدم ہے۔ اسی راہ پر گامزن ہوتا ہوا انسان ملکوتی صفات پیدا کرسکتا ہے' پیمبرانہ نظر

اور عمل کا نمونہ بن سکتا اور آخر میں خدا میں مطلقاً محو یا فنا ہونے کی بجائے الٰہی صفات کو اپنے اندر جذب کرسکتا ہے :

بزیر کنگرہٗ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اپنے مرشد عارف رومی کے اسی خیال کو اقبال نے اپنے شعر میں باندھا ہے کہ :

در دشت جنون من جبریل زبون صیدے یزدان بکمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال رومی کی طرح اثبات خودی کا معلم ہے ۔ اس لئے وہ ہر ایسے تصوف سے نالاں ہے جو ترک اور فنا پر زور دیتا ہے اور اخلاق و حیات آفریں پہلو سے گریز کرتا ہے ۔ وہ خودی کے دوش بدوش بے خودی کے اسرار اور اس کی صداقت سے ناواقف نہیں لیکن اقبال کے ہاں بے خودی بیہوشی اور ترک تمنا کا نام نہیں ۔ اس کے ہاں بے خودی وہ کیفیت ہے جو خودی کے ممکنات کو وجود پذیر کرتی ہے اور اس کو کمزوری سے قوت کی طرف اور تنگی سے وسعت کی طرف لے جاتی ہے ۔ قرآن کا آدم مسخر کائنات ہے اور زندگی کے میدان کار زار کا ایک مجاہد سپاہی ہے ۔ اصل جہاد خانقاہوں کے زاویوں میں بیٹھ کر محض ذکر اور فکر سے نفس کشی کی مشق نہیں ۔ جہاد اکبر اسی کا نام ہے جو نبی کریم اور صحابہ کرام نے کیا ۔ غلط تصوف کے ساتھ قناعت اور توکل کا بھی ایک غلط مفہوم پیدا ہو گیا ۔ اس تصور کے خلاف بھی اقبال نے جہاد کیا :

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

اپنے دامن کو حرص و ہوا سے نہیں بلکہ بلندیٔ مقاصد سے اتنا وسیع کرو کہ تمام کائنات اس میں سما جائے ۔ یہ وسعت تنہائی میں نفس کشی کی مشق سے نہیں بلکہ علم و عمل کی لامتناہی جد و جہد سے حاصل ہوتی ہے ۔ غالب کا ایک نہایت لطیف شعر اسی مضمون کا ہے :

مہر چہ در مبدٔ فیاض بود آن من است
گل جدا نا شدہ از شاخ بدامان من است

معراج نبی کے متعلق سرمد کی ایک لاجواب رباعی ہے :

آن را کہ سرّ حقیقتش باور شد خود پہن تراز سپہر پہناور شد
ملا گوید بر شد احمد بفلک سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

صحیح تصوف جو اسلام میں کسی ایک گہری اور باطنی شکل کا نام ہے ، اقبال کے افکار و تاثرات میں جابجا نمایاں ہے ۔ مادی اور منطقی عقل اور عشق کا تقابل تصوف کی اساس ہے ۔ اس مضمون میں اقبال نے ایسی گہرائی ، ایسی بلندی اور ایسی وسعت پیدا کی ہے جس نے اس کو سنائی و عطار و رومی کی صف میں کھڑا کر دیا ہے ۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ اس بارے میں متقدمین سے آگے نکل گیا ہے ۔ وہ تصوف کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کر کے اسلام کی روح پرور اور ارتقاٗ پسند تعلیم کو اجاگر کرنا چاہتا ہے ۔